بنگلہ دیش پر
مغربی استعمار کی نئی یلغار

مسلم مجلہ

زمانہ بدلا، تو مغربی عیسائی استعمار نے اپنا روپ اور اپنے طور طریقے بھی بدل دیے۔ مسلمانوں پر تسلط رکھنے کے لیے ان کو براہ راست اپنے قبضہ میں رکھنا ممکن نہ رہا، تو پرانے شکاریوں نے نئے جال بچھا دیے۔ پہلے فکر معاش دے کر روح قبض کی، پھر ترقی معاش کے سراب کا دیوانہ بنایا، اور پھر امداد اور قرضوں کے سنہری تاروں میں باندھ کے بے دست و پا کر دیا۔ افسوس کہ فرعون کو کالجوں اور بہبود آبادی کی نہ سوجھی، ورنہ مفت میں قتلِ اولاد کے لیے بدنام نہ ہوتا۔

ایک نیا سنہری جال این جی اوز NGOs یا نان گورنمنٹل آرگنائزیشن کا، یعنی غیر سرکاری تنظیموں کا ہے۔ ترقی و تعلیم، فلاح و بہبود اور ریلیف کے نام پر این جی اوز کس طرح ایک پس ماندہ مسلمان ملک کو اپنے شکنجہ میں کس لیتی ہیں، اس کی ایک مثال بنگلہ دیش ہے۔ کیوں کہ بنگلہ دیش خانہ جنگی اور بڑی تباہ کاری کے نتیجے میں بنا، اس لیے وہاں کی زمین ترقی و بہبود کے بھیس میں کام کرنے والی ان تنظیموں کے لیے کچھ زیادہ ہی زرخیز ثابت ہوئی۔ حکومت بنگلہ دیش نے ان تنظیموں کو قواعد و ضوابط کا پابند بنانے کا سوچا، اور ان کی نگرانی کے لیے ایک این جی اوز بیورو قائم کیا۔ مگر یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی، اور جلد ہی اس کو مغرب کے "فیاض و مخیر" ممالک کے آگے گھٹنے ٹیکنا پڑے۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کے نتیجے میں ان تنظیموں کے بارے میں قیمتی معلومات جمع ہو گئیں۔ پاکستان، ہمارے علم کی حد تک، ان معلومات سے بھی محروم ہے۔ بنگلہ دیش میں این جی اوز کے تاریک سایوں کے بارے میں ہم امپیکٹ انٹرنیشنل، لندن کے شکریہ کے ساتھ ان کے مضمون کا ملخص ترجمہ ذیل میں شائع کر رہے ہیں۔ (مدیر)

اگست ۱۹۸۹ ڈھاکا کے اخباروں نے سنسنی خیز سرخیاں لگائیں : "حکومت نے بدطینت اور بدعنوان این جی اوز کے آگے ہتھیار ڈال دیے"، "ایسٹ انڈیا کمپنی واپس آگئی ہے"، "ہماری آزادی پر نقب لگانے کا منصوبہ"۔

ہوا یہ تھا کہ این جی اوز بیوریو کے ڈائریکٹر جنرل نے دو تنظیموں کی رجسٹریشن منسوخ کر دی تھی۔ ایک ادب (ADAB)، یعنی ایسوسی ایشن آف ڈویلپمنٹ ایجنسیز ان بنگلہ دیش جسے قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب اور سیاسی سرگرمیوں میں ملوث پایا گیا تھا۔ دوسری سیبا (SEBA)، یعنی سوسائٹی فار اکنامک اینڈ بیک ایڈمنسٹریشن جو خورد برد اور بغیر اجازت ایک غیر ملکی سفارت خانہ سے رقوم وصول کرنے کی مرتکب تھی۔ یہ فیصلہ وزیراعظم سیکرٹریٹ میں کیا گیا، لیکن مغربی سفارت خانے فوراً حرکت میں آئے اور تین گھنٹے کی مختصر مدت میں "ادب" اور "سیبا" دونوں اپنے کام پر واپس آگئیں۔

حال میں یہ کہانی ایک مرتبہ پھر دہرائی گئی، جب این جی او بیوریو نے خورد برد اور پیسہ دے کر لوگوں کا مذہب تبدیل کرانے پر انٹرنیشنل کرسچین فیلوشپ اور بعض دوسری تنظیموں کا رجسٹریشن منسوخ کر دیا۔ سرپرست سفیران کرام کا ایک وفد فوراً وزیراعظم کے پاس پہنچ گیا، اور انھیں بتایا کہ "اگر ان اداروں کو بحال نہیں کیا گیا تو حکومت کی امداد روکی جا سکتی ہے"۔ خالدہ ضیا جانتی تھیں کہ یہ خالی خولی دھمکی نہیں۔ احکام واپس لے لیے گئے، اور بیوریو کے ڈائریکٹر جنرل، شاہد العالم کا فی الفور تبادلہ کر دیا گیا۔

اخبارات ہی نہیں، بنگلہ دیش کے عوام بھی کئی مقامات پر ان تنظیموں کے خلاف غصہ سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے سڑکوں پر نکل کر بڑے بڑے مظاہرے کر چکے ہیں۔ لیکن یہ کوئی ایسی کہانی نہیں جو حکومت کے علم میں نہ ہو۔ اس کی فائلوں میں سب معلومات موجود ہیں۔ بات یہ نہیں کہ وہ کچھ کرنا نہیں چاہتی، بلکہ وہ بے بس ہے اور کچھ کر نہیں سکتی۔

تعداد اور وسائل

بنگلہ دیش ان ملکوں میں سرفہرست ہے جہاں چپہ چپہ پر بیرونی این جی اوز کا جال بچھا ہوا ہے۔ ملک بھر میں ان کی تعداد ۱۶ ہزار ہے، یعنی اوسطاً ہر ۵ ۳ مربع میل میں ایک۔ این جی اوز کی کل آمدنی کے بارہ میں صحیح اعداد و شمار میسر نہیں۔ اس لیے کہ، حکومت کے ضابطوں کے باوجود، یہ اپنے تمام وصول کردہ فنڈز ظاہر نہیں کرتیں۔ ۱۹۸۴ میں صرف عیسائی تنظیموں کی سالانہ ظاہر کردہ آمدنی ۸ کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر تھی۔ لیکن ورلڈ بنک، ایشین ڈویلپمنٹ بنک اور دوسرے امدادی ادارے ان تنظیموں کو اس سے کہیں زیادہ رقوم فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ، این جی اوز کو ان کی حکومتیں براہ راست بھی فنڈز فراہم

کرتی ہیں۔ مزید ستم یہ کہ مختلف ملک اور ادارے جو امداد بنگلہ دیش کو دیتے ہیں، اس میں یہ شرط لگا دیتے ہیں کہ اس امداد کا ایک مخصوص حصہ ان کی نامزد کردہ این جی اوز کے ذریعہ ہی خرچ کیا جائے گا۔ مثلاً، امریکا یہ پابندی لگاتا ہے کہ فوڈ فار ورک (کام کے بدلہ غذا) پروگرام کی رقوم ایک عیسائی خیراتی ادارہ کیئر (Care) کے ذریعہ ہی خرچ کی جائیں گی۔

ان تنظیموں کو ملنے والی بھاری رقوم کا بڑا حصہ ان کے اپنے ہی اللوں تللوں میں اڑا دیا جاتا ہے۔ ۶۰ فی صد فنڈز غیر ملکی رضاکاروں، ماہرین اور مشیروں کی بھاری تنخواہوں اور سہولتوں پر لگ جاتے ہیں، ۱۰ فی صد دفتری اخراجات پر جبکہ بنگلہ دیشی عملہ کے حصہ میں ۱۵ فی صد آتا ہے، مگر جن غریبوں کے درد میں یہ تنظیمیں میدان میں آئی ہیں ان کو مشکل سے ۵ فیصد نصیب ہوتا ہے۔ جس ملک میں ماہانہ آمدنی ایک ہزار ٹکا (۲۵ ڈالر) سے مشکل ہی سے بڑھ پاتی ہے، وہاں کچھ این جی اوز کے سربراہ ایک لاکھ سے تین لاکھ ٹکا تک تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ بڑی بڑی رقمیں نئے نئے ماڈل کی کاروں اور افسران کے لیے فائیو اسٹار ریسٹ ہاؤسوں کی تعمیر پر خرچ کی جاتی ہیں۔ پلاننگ کمیشن کے ممبر، ڈاکٹر شیخ مقصود علی کی رائے میں این جی اوز کے ترقیاتی بجٹ کا ۸۰ فی صد مستحقین کو پہنچنے کے بجائے انھیں پہنچانے والوں پر خرچ ہو جاتا ہے۔ پلاننگ کمیشن کے سامنے پیش کیے گئے منصوبوں میں اکثر اعداد و شمار غلط ہوتے ہیں، اور زمین، دفاتر اور رسل و رسائل کی مدوں میں تخمینہ اصل سے کہیں زیادہ ظاہر کیا گیا ہوتا ہے۔

اخراجات کی مدوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر این جی اوز اپنے فنڈز اعلان کردہ منصوبوں سے ہٹ کر دوسرے منصوبوں پر خرچ کرتی ہیں۔ این جی اوز بیوریو کے آڈیٹروں نے ۱۰۰ تنظیموں کے حسابات دیکھے تو ۸۰ فی صد میں مالی بدعنوانیوں، کرپشن اور خفیہ بنک اکاونٹوں کا انکشاف ہوا۔ ایک تنظیم نے تقریباً ۲۰ لاکھ ٹکا ریلیف ورک کے لیے نکالے، لیکن صرف ۳۲ ہزار ۷ سو ٹکا تقسیم کیے۔ دو اور این جی اوز کے حسابات میں سائیکلون ریلیف کے بہانہ ۵۰ لاکھ اور ایک کروڑ ٹکا کی رقمیں غلط مدوں میں خرچ کی گئیں۔

این جی اوز اپنے فنڈز کے ذریعہ سیاسی اثر و رسوخ بھی خریدتی ہیں۔ سرکاری افسروں کے بنگلے اونچے اونچے کرایوں پر حاصل کیے جاتے ہیں، اور ان کے بچوں، بھانجوں اور بھتیجوں کو بے نام کی عمدہ ملازمتیں دی جاتی ہیں۔

ان این جی اوز کا اپنے بارہ میں پھیلایا ہوا امیج (تاثر) یہ ہے کہ وہ "دنیا کے غریب ممالک میں غربت دور کرنے اور تعلیم و ترقی عام کرنے میں مقامی حکومتوں اور عوام کی شریک کار ہیں"۔ لیکن بنگلہ دیش کے چوٹی کے ماہرین معاشیات کی رائے میں: "ان کے ملک میں طاقت ور اور ماں دار مغربی شرکائے کار کے ارتکاز کے باوجود، حقیقی ترقی میں ان کا حصہ نہ صرف بہت کم، بلکہ سماجی لحاظ سے منفی ہے۔"

ڈاکٹر شیخ مقصود علی پلاننگ کمیشن کے رکن ہیں۔ انھیں ایسی کوئی شہادت نہیں ملی کہ بھاری فنڈز دینے کے باوجود ان علاقوں میں لوگوں کی شرح آمدنی میں کوئی اضافہ ہوا ہو جہاں این جی اوز نے اپنے منصوبے شروع کر رکھے ہیں۔ ڈاکٹر سید مصباح الدین، جہانگیر نگر یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر ہیں۔ ان کے بقول بھی ترقی کے دو اہم سیکٹروں، یعنی زراعت اور صنعت میں این جی اوز کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

ان کی ایک سرگرمی، چھوٹے کاروبار کے لیے قرض دینے کی بھی ہے۔ لیکن واپسی کا نظام ایسا ظالمانہ ہے کہ قرضہ دار ۲۰ سے ۳۰ فیصد سود ادا کرتا ہے۔ ایک تنظیم ۲۲۶ فیصد سود حاصل کر لیتی ہے۔ این جی اوز بیوریو کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ تنظیمیں غریبوں کی محتاجی ختم کرنے کے لیے شاذ ہی کام کرتی ہیں۔ بیشتر غریبوں کے حقیقی مسائل سے بے نیاز ہوتی ہیں اور انھیں ان لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ فینی اور مانک گنج کی بعض آبادیاں ان غیر ملکی تنظیموں کی اتنی محتاج ہو گئی ہیں کہ عملاً ان کی رعایا بن کر رہ گئی ہیں۔ کئی بنگلہ دیشی مبصرین کی رائے میں یہ شکنجہ تو روایتی ہندو بنیے کے شکنجہ سے بھی زیادہ خوفناک اور خطرناک ہے۔

عیسائیت مذہبی اور سماجی تبدیلی کا منصوبہ

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ این جی اوز دراصل کیا کام کر رہی ہیں؟ ایک سیاسی و سماجی انقلاب برپا کر کے "روشنی اور تہذیب" لانا، اور "تاریک اور شب گرفتہ" مسلم بنگال کی دھرتی پر تعمیر و ترقی کی چکاچوند کرنا!

این جی اوز کی بڑی تعداد عیسائی مشنریوں پر مشتمل ہے، اگرچہ بالعموم ان کے ناموں سے یہ حقیقت ظاہر نہیں ہوتی۔ ان میں سے کچھ تو علانیہ کہتی ہیں کہ وہ انجیلی ہیں، جبکہ اکثریت کی مثال خیمے کی "کھونٹیوں" جیسی ہے۔ یہ "کھونٹیاں" اپنے طریقۂ واردات میں بے حد عیار اور چالاک ہیں۔ یہ اپنے مبلغ ہونے کا اظہار نہیں کرتیں، بلکہ سماجی کارکن، تاجر انجینئر اور ڈاکٹر کے بھیس میں اپنا کام کرتی ہیں۔

بنگلہ دیش میں مشنریوں کی سرگرمیوں کا آغاز ۱۷۵۷ کی جنگ پلاسی سے ہوا۔ ۱۹۴۷ میں عیسائیوں کی تعداد ۵۰ ہزار تھی، مئی ۱۹۷۱ میں یہ تعداد چار گنا ہو کر دو لاکھ تک پہنچ گئی، اور ۱۹۹۱ میں یہ تعداد دگنی ہو کر چار لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ این جی اوز کا ہدف اگلے ۲۰ سال میں اس تعداد کو ایک کروڑ تک پہنچانا ہے۔

"اسد ایونیو" زیادہ تر نئے عیسائیوں کی ملکیت ہے، اور میرپور "گرجوں کا شہر" بن چکا ہے۔ تشویشناک امر یہ ہے کہ مسلمان بھی عیسائی بن رہے ہیں۔ انڈونیشیا کی طرح اب بنگلہ دیش بھی یہ رائے

ظاہر کرتا ہے کہ یہ رائے صحیح نہیں ہے کہ ایک مسلمان، عیسائی نہیں بن سکتا۔ ایک "متزلزل مسلمان" کو اب پہلے سے کہیں زیادہ آسانی کے ساتھ "متزلزل عیسائی" بننے کی طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔

بنگلہ دیش بنا تو اس نے خود کو ان بین الاقوامی طاقتوں کی گود میں پایا، جن کا اپنا معاشی، سیاسی اور مذہبی ایجنڈا تھا۔ وہ اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی خواہاں تھیں اور اس کی سماجی، معاشی اور سیاسی ساخت کو اس حد تک کمزور کرنا چاہتی تھیں کہ جہاں قوم خود بخود ایک نئی نو آبادیاتی نوکری میں جا گرے۔ ڈھاکہ میں ینگ مینز کرسچین ایسوسی ایشن (وائی ایم سی اے) کے جاری کردہ کتابچے "عوام سے عوام تک" میں لکھا ہے: "بنگلہ دیش کے سماجی ڈھانچے کو تعلیمات انجیل کے مطابق ڈھالنے کے عمل میں عیسائی تحریک کو لازماً ایک بھرپور قوت ہونا چاہیے"۔

بنگلہ دیش میں سرگرم عمل غیر ملکی فلاحی تنظیموں کے مقاصد میں کسی قسم کا کوئی ابہام یا اختلاف نہیں ہے۔ کسی کا مطمح نظر فلاح و بہبود نہیں ہے، سب کا مقصد یہ ہے کہ قوم کے سماجی ڈھانچے کو تبدیل کیا جائے۔

این جی اوز بیورو نے ایسی ۵۲ این جی اوز کی نشاندہی کی ہے جو براہ راست لوگوں کو عیسائی بنانے میں مصروف ہیں۔ مگر مذہبی اور سیکولر این جی اوز میں فرق صرف ظاہری وضع کا ہے، مقاصد کا نہیں۔ سیکولر این جی اوز مذہبی لحاظ سے غیر جانبدار ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں، مگر معاشرے کی روح اور اقدار کو بگاڑنے میں معاونت کرتی ہیں۔ جب کہ مشنری این جی اوز کھلے بندوں تباہ حال روحوں کی پکی فصل کاٹنے کے لیے کوشاں ہیں۔

این جی اوز بیورو رپورٹ نے ان کے طریقوں کی ایک دلچسپ اندرونی تصویر پیش کی ہے۔ مذہب کی تبدیلی اور عیسائی بنانے کے لیے کمزوروں کا انتخاب کیا جاتا ہے یعنی عورتیں، بچے، ان پڑھ یا بے یار و مددگار اور غربت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے بے بس اور محروم لوگ۔ کچھ این جی اوز مسلمان سمیت اپنے تمام عملے کے لیے بائبل پڑھنا لازمی قرار دیتی ہیں۔ ایک بڑی مشنری این جی او نے اپنے قائم کردہ اسکولوں میں صرف عیسائی اساتذہ مقرر کیے ہیں اور ہوسٹل میں رہنے کے خواہش مند طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ عیسائی ہوں۔ اکثر مشنری سکولوں میں طالب علموں کے لیے عیسائیت پڑھنا لازمی ہے۔ ایسے ہی ایک کیس میں جب ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر نے اس بے ضابطگی کی طرف توجہ دلائی تو اسے جواب ملا: "ہمیں آپ کی حکومت فنڈز دیتی ہے نہ ہم اس کے سامنے جواب دہ ہیں"

اکثر عیسائی این جی اوز کی پالیسی ہے کہ "مسلمان کو آخر میں ملازمت دو اور نئے عیسائی کی دستگیری کرو"۔ اس پالیسی کا مقصد معاشی اور تعلیمی لحاظ سے ایک موثر عیسائی طبقہ پیدا کرنا ہے جو، افریقہ کے بہت

سے خطوں کی طرح، آگے چل کر یہاں بھی طاقت کے کلیدی سیکٹروں پر کنٹرول حاصل کر سکے۔ جیسے تعلیم، معیشت، بیوروکریسی، فوج اور سماجی پالیسی وغیرہ۔

خواتین میں تبلیغی کام "پروگرام برائے سماجی بیداری" کا نقاب اوڑھ کر کیا جاتا ہے۔ سماجی بیداری کا یہ پروگرام خواتین سے اسلامی ثقافت اور خاندانی اقدار چھڑا کر انھیں "آزادی نسواں" اور ضبطِ تولید کی آزاد اور ڈھیلی ڈھالی اخلاقیات سے متعارف کرواتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو خریدنے کا کاروبار بھی خاموشی سے جاری و ساری ہے۔ ان بچوں کو عیسائی بنا کر باہر بھیج دیا جاتا ہے۔

تاہم غور کرنے کی بات یہ ہے کہ وائی ایم سی اے، جسی تبدیلی کی خواہاں ہے، وہ پہلے سماجی ڈھانچے میں رونما ہوگی یا پہلے ملک کا "سیاسی ڈھانچہ" تبدیلی کے عمل سے گزرے گا۔

سیاسی تبدیلی کا منصوبہ

ان تنظیموں کا ایک اور رول ایسے پریشر گروپس قائم کرنا، اور انھیں فنڈ فراہم کرنا ہے، جو سیاست میں سیکولر اور غیر اسلامی عناصر کے حق میں اور اسلامی اور قوم پرست طاقتوں کے خلاف اثر انداز ہوں۔ امداد عوام تنظیم (GSS) کو اوکس فیم (Oxfam) کی سرپرستی حاصل ہے، اس نے جو تعلیمی نوازمہ تیار کیا ہے، وہ اسلام دشمنی اور ہندو نوازی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایک اور ادارہ نائیجر اکوری (NK) ہے، جسے متنازعہ سیاسی مسائل میں کوئی موقف اختیار کرنے اور سرکاری ہدایات کی خلاف ورزی میں کوئی تامل نہیں ہے۔ NK کو War on Want اور Christian Aid جیسے متعدد بیرونی اداروں کا تعاون حاصل ہے، اور حکومت نے بھی بے گھر لوگوں کے منصوبوں کے لیے اسے بڑے بڑے قطعات اراضی لیز پر دے رکھے ہیں۔ ایسے حکومت کی منظوری اور علم کے بغیر فنڈز فراہم ہوتے ہیں۔ یہ سب این جی اوز بھارت نواز، متشدد، سیکولر، اسلام دشمن اور طبقاتی اور جنسی تفریق کو بڑھانے والے ہیں۔

تنظیمیں پریشر گروپ کی بالواسطہ حکمت عملی کے ساتھ ساتھ، ملک کی سیاست میں براہ راست بھی دخل دے رہی ہیں۔ بیورو کی رپورٹ کے مطابق ایسی ۱۶ غیر ملکی تنظیمیں سیاسی طور پر سرگرم ہیں، جو رسالے اور خبرنامے جاری کرتی ہیں، سیاسی موقف اختیار کرتی ہیں، اور اسلامی قوانین پر تنقید کرتی ہیں، اپنی پسند کی سیاسی پارٹیوں کو رقوم فراہم کرتی ہیں، بلدیاتی انتخابات میں اپنے من پسند امیدوار کھڑے کرتی ہیں۔ قومی اسمبلی کے انتخابات میں بھی انھوں نے اپنی پسند کے امیدواروں کی حمایت کی۔

بنگلہ دیش کے سیاسی مبصرین کے خیال میں چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں کی سیاست میں این جی اوز کی براہ راست مداخلت حد درجہ بڑھ گئی ہے، اور اس سے بھارت کے حمایت یافتہ گروپ شانتی

باہنی (امن کور) کی شورش کو شہ ملی ہے۔ این جی اس خطے کی صورتحال جنوبی سوڈان سے کسی حد تک ملتی جلتی ہے، جہاں این جی اوز نے بہبود فراہم کرنے والے اور باغیوں کے "انسانی حقوق کے محافظوں" کے طور پر خود کو تعینات کر رکھا ہے۔ یہ این جی اوز، مغربی سفارت خانوں، امریکی کانگریس مینوں اور انسانی حقوق کی مغربی لابیوں کو متحرک کرنے میں شانتی باہنی کی مدد کرتی ہیں، تاکہ وہ بنگلہ دیشی حکومت پر اپنا دباؤ بڑھائیں۔ شانتی باہنی کا خفیہ خبرنامہ "راڈار" (Radar) ایسے مواد پر مشتمل ہوتا ہے جو کسی این جی او نے فراہم کیا ہوتا ہے۔ اگر برطانوی ہائی کمشنر بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ کو خط لکھتا ہے تو اسے "راڈار" میں پڑھا جا سکتا ہے۔

بیرونی مداخلت

گزشتہ برس اپریل میں خبر آئی کہ حکومت این جی اوز کے کام کو ضابطہ میں رکھنے والے قوانین میں اس نقطہ نظر کے ساتھ ترمیم کر رہی ہے، تاکہ غیر ملکی فلاحی اور امدادی ادارے ملکی مفاد کے منافی سرگرمیوں اور ملکی سیاست میں ملوث ہونے سے باز رہیں۔

اسی روز ڈھاکا میں امریکی سفیر نے ایک ظہرانے میں کہا: "طاقت کے متنوع مراکز کے بارے میں مشتبہ ہونے کی ضرورت نہیں، جیسے کہ این جی اوز وغیرہ، اور نہ ہی ان سے دشمنوں جیسا سلوک کرنا چاہیے۔ ہمارے تجربے کے مطابق تو این جی اوز بہتر کام اور معاشرے کی بہتر خدمت کر سکتی ہیں بشرطیکہ انھیں کم سے کم کنٹرول کیا جائے۔" امریکی سفیر نے یہ بھی کہا: "مختلف گروپوں مثلاً بزنس ایسوسی ایشنز، این جی اوز اور ٹریڈ یونینوں کو حکومت کا مخالف ہونا چاہیے نہ حکومت کا حمایتی"۔

امریکی سفیر کی طرف سے "طاقت کے مختلف مراکز" کا نظریہ پیش کرنے کے بعد عالمی بنک کے مقامی نمایندے نے این جی اوز کے کردار میں توسیع کا مطالبہ کیا اس کے مطابق: (۱) - امداد دینے والے ممالک چاہتے ہیں کہ این جی اوز ملکی ترقی میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں اور (۲) وہ امداد باہمی کی کاروائیوں اور پروگراموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں کیونکہ حکومتی اداروں کی کارکردگی تسلی بخش نہیں۔ لیکن این جی او "ادب" کی کوارڈی نیٹر مس خوشی کبیر نے کہا ہے کہ یہ قانون "گھٹن کا ماحول پیدا کر دے گا اور اس بات کو ناممکن کر دے گا کہ این جی اوز ترقیاتی کام چلا سکیں۔" اس تنبیہہ کے ساتھ ساتھ مس خوشی کبیر نے مجوزہ قانون کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ "یہ قانون حکومت کی آزاد روی کی پالیسی اور جمہوری عمل کو فروغ دینے کے اعلان سے مطابقت نہیں رکھتا۔"